66

ہر کام میں استقلال سے کام لینا چاہئے

(فرمودہ ۹- ستمبر ۱۹۳۲ء بمقام ڈلہوزی)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

اللہ تعالیٰ کی صفات بندوں کے لئے ایک نمونہ ہیں اور حسن کامل در حقیقت ذات الٰہی میں ہی پایا جاتا ہے- اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ذات ہے جس کو نظرانداز کرکے ہم نیکی کی کوئی تعریف کر ہی نہیں سکتے- خدا تعالیٰ کو چھوڑتے ہوئے دنیا نے نیکی کی تعریف کرنا چاہی لیکن قطعاً کامیاب نہ ہو سکی اور یہ راہ اختیار کرنے والوں نے مونہہ کی کھائی- بعض نے کہا نیکی وہ ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہو' حالانکہ کسی کام کا فطرتِ انسانی کے مطابق ہونا ایسی اصطلاح ہے جس کی کوئی بھی تعیین نہیں ہو سکتی مثلاً ایک ہندو سے پوچھو گوشت کھانا کیسا ہے تو وہ رام رام کہتا ہوا اسے پاپ قرار دے گا- ایک جینی سے دریافت کرو کہ گوشت کھانا کیسا ہے تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ گوشت بھی کوئی کھانے کی چیز ہے لیکن گوشت ہی کے متعلق کسی مسلمان سے پوچھ کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ گوشت کے بغیر اسے کھانے میں مزا ہی نہیں آتا- غرض نیکی اور بدی کے متعلق محض انسان کی فطرت کے فیصلہ کو پیش کرنا درست نہیں ہو سکتا' کیونکہ بسا اوقات وہ بہت جلد مسخ کر دی جاتی ہے- اور کوئی یقینی اور قطعی معیار ہمارے سامنے نہیں رکھ سکتی- بعض لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نیکی وہ فعل ہے جس سے سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہو- لیکن اسے بھی ہم کیونکر درست کہہ سکتے ہیں جبکہ کئی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض کام فائدہ مند معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً نہ صرف یہ کہ انہیں نیکی نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ بدیوں میں شمار ہوتے ہیں- مثلاً کوئی شخص کسی کا مال اٹھا کر لے جائے- پھر اس شخص کو بھی جس کا مال اٹھایا گیا موقع مل جائے کہ اٹھانے والے کا سامان چوری

کرے۔ اب بظاہر اس شخص کا جس کا مال پہلے چرایا گیا' اس میں فائدہ ہے کہ دوسرے کا مال اٹھالے اور پولیس میں رپورٹ وغیرہ دینے کی زحمت میں نہ پڑے کیونکہ اگر رپورٹ کرے گا تو پھر اسے عدالت میں بھی جانا پڑے گا۔ وکیل کرنا ہوگا۔ اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن چوری کے طریق سے مال حاصل کر کے وہ زیادہ فائدہ میں رہ سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس طریق کو ہم بدی کہتے ہیں اور جس میں صعوبت اور تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے وہ صحیح طریق عمل ہے۔

پھر کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ نیکی وہ ہے جس میں سب سے زیادہ فائدہ سب سے زیادہ لوگوں کو ہو۔ لیکن یہ بھی غلط ہے مثلاً دیکھو جب حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے تو وہ اکیلے تھے' کثرت یہود کی تھی۔ اور اس کثرت کا فائدہ اس میں تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کردے۔ بے شک کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ نسلوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ رکھا جاتا لیکن سوال یہ نہیں کہ آئندہ نسلوں کا فائدہ کس میں ہے بلکہ کوئی کام اس اصل کے ماتحت تو کسی شخص کے لئے نیکی تب بنے گا جب وہ خود اس کے لئے سودمند ہو۔ غرض دنیا خدا تعالیٰ سے علیحدہ ہو کر نیکی کی تعریف تک نہیں کر سکی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جس نے ایسے تمام جھگڑوں کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اور سچی اور اصل بات یہی ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی ذات سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو نیکی و بدی کا کوئی معیار اس کے لئے رہتا ہی نہیں۔ اور یہ بھی ہستی باری تعالیٰ پر ایک بڑی اور زبردست دلیل ہے۔ آج دنیا میں وہ لوگ بھی بستے ہیں جنہیں دنیا وہم ہی وہم نظر آتی ہے۔ سب سے یقینی چیز انسان کا اپنا وجود ہے۔ لیکن سوفسطائیوں نے اسے بھی وہم ہی قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ سوفسطائیوں کے گروہ کا ایک شخص کسی بادشاہ کے دربار میں گیا اور وہاں جاکر کہنے لگا کہ اس دنیا کا کوئی حقیقی وجود سمجھنا محض ایک وہم ہے۔ درحقیقت جو کچھ نظر آتا ہے' ہمارے اپنے خیال کا نتیجہ ہے ورنہ ایسی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بادشاہ کو جو سوجھی تو اس نے ایک مست ہاتھی کو ایک بڑے کمرہ میں بند کر دیا اور اس شخص سے کہا کہ اس کمرہ کے اندر رہ جاؤ۔ جب وہ شخص اندر گیا تو مست ہاتھی کو دیکھ کر بھاگا۔ بادشاہ نے کہا میاں بھاگتے کیوں ہو یہ ہاتھی تو محض وہم ہی وہم ہے' حقیقت میں کچھ نہیں۔ اس وقت بادشاہ کو خیال تھا کہ میں نے اب اسے خوب قابو کیا ہے اور اس کا سوفسطہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ لیکن وہ بھی کچھ ایسا کچا نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا بادشاہ سلامت بھاگتا کون ہے میرا بھاگنا جو آپ کو نظر آرہا ہے' یہ وہم ہی وہم ہے۔ اس طرح پھر بات وہیں کی وہیں آرہی۔ خیر سوفسطائیوں کا خیال تو بے وقوفی اور حماقت ہے لیکن اس میں بھی

کچھ شک نہیں کہ اگر ذاتِ الٰہی کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو پھر ایک چیز بھی دنیا میں ایسی نہیں رہتی جس کے متعلق قطعیت کا دعویٰ کیا جا سکے اور کہا جا سکے کہ یقینی ہے۔ ہاں جب یہ یقین کر لیا جائے کہ کوئی علیم کل ہستی ہے جو صفات کاملہ رکھتی ہے، جو ازلی ابدی ہے تو پھر ہماری ہر چیز یقینی بن جاتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب حقیقت اشیاء کے تعلق میں اس ذات کامل کی طرف مرافعہ لے جائیں جو تمام اشیاء کی خالق ہے اور وہ ہمیں بتلائے کہ اس میں حقیقت ہے تو وہ چیز متحقق ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کی حقانیت کا علم ایک کامل علیم و خبیر ہستی نے ہمیں دیا۔

الہام الٰہی کے بعد تحقیق اشیاء کا ایک ذریعہ عقل بھی ہے لیکن عقل ہمیشہ صحیح نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی۔ علماء اور محققین نے عقل کے نتائج کو غیر یقینی قرار دیا ہے۔ اس صورت میں جب اشیاء کی تحقیقاتوں کی تمام بنیاد عقل پر رکھی جائے اور عقل غلطی کر سکتی ہے تو اس طرح تمام علوم ظنی اور شکی ہو جائیں گے اور شک سے آگے ان کی حیثیت نہیں بڑھ سکے گی۔ لیکن اگر حقیقت اشیاء کے لئے صفات الٰہیہ کو اصل منبع بنایا جائے تو خدا تعالیٰ کی صفات ہمارے لئے یقینی طور پر دلیلِ راہ بن سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی بھی ہے۔ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہستی جس کے کاموں میں وقفہ نہ پڑے کیونکہ ربوبیت کے کاموں میں اگر ایک منٹ کے لئے بھی وقفہ پڑ جائے یا ایک منٹ کے لاکھویں حصہ کا بھی التواء ہو جائے تو ربوبیت ربوبیت نہیں رہتی اور شدید نقص پیدا ہو جائے۔ غرض صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت استقلال کامل کی بھی ہے۔ میں نے استقلال کا لفظ بولا ہے جو اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بولا جا سکتا۔ جب بھی ذات باری کے لئے اس کا استعمال ہو گا اضافت کے ساتھ ہی ہو گا۔ لیکن سمجھانے کے لئے اسے استعمال کرتا ہوں۔ غرض ایسا استقلال جس میں کوئی نقص نہ ہو جس میں سیکنڈ کے اَن گنت حصہ کے لئے بھی التواء نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ یہی صفت جب تک انسان اختیار نہ کرے، وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ غیر مستقل آدمی کی مثال قرآن مجید میں ایسی عورت سے دی گئی ہے اَلَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا[1] جو اپنا سوت آپ ضائع کر دے۔ ایسے لوگ بے شک نیکی کے کام کریں گے لیکن بہت جلد ان سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ نمازیں پڑھیں گے لیکن پھر سستی شروع کر دیں گے۔ اخلاق فاضلہ دکھائیں گے لیکن پھر تساہل کی طرف میلان شروع ہو جائے گا۔ قومی خدمت میں مصروف ہوں گے پھر غفلت ہو جائے گی۔ چندے دیں گے لیکن

جلدی ہی باقاعدہ ادائیگی فراموش ہو جائے گی۔

غرض کسی کام کو بھی مسلسل جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی قربانیاں کر کے بھی ان فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں جو ان قربانیوں کے نتیجہ میں انہیں ملنے چاہئیں۔ وہ نمازیں پڑھتے ہیں' قومی خدمات میں اپنے اوقات خرچ کرتے ہیں' چندے دیتے ہیں لیکن انعام ملنے سے پہلے ہی غافل ہو کر انعام سے محروم رہ جاتے ہیں۔ غرض ان کی مثال اَلَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا کی سی ہوتی ہے۔ وہ اپنے تحمل کو اس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب نتیجہ نکلنے والا ہوتا ہے۔ اگر وہ کچھ اور صبر کرتے یہاں تک کہ انہیں انعام مل جاتا تو پھر انہیں استقلال قائم رکھنے کے لئے زیادہ جدوجہد نہ کرنا پڑتی کیونکہ پھر استقلال بہت حد تک خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ہی دیکھ لو جس شخص کو ماہ بماہ تنخواہ مل جاتی ہو اور ہر طرح آرام میں ہو' کیا وہ نوکری چھوڑ دیا کرتا ہے۔ ہاں اگر باوصف کام کرنے کے تنخواہ نہ ملے تو پھر نوکری چھوڑنے پر وہ مجبور ہو گا۔ ہمیشہ بے استقلالی اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی آدمی انعام حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنے انعام کو چھوڑ دے۔ لیکن اگر کسی کو اس کے کام کا انعام مل جائے تو پھر وہ اسے نہیں چھوڑے گا سوائے ایسی صورت کے کہ وہ بالکل ہی کم ہمت اور نکما ہو۔

الٰہی انعام کے متعلق ایک اور اصل بھی ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں اگر کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد آئندہ کام کرنا بند کر دیا جائے تو کئے ہوئے کام کی تو مزدوری مل جائے گی' ہاں آئندہ کوئی انعام نہیں ملے گا۔ لیکن الٰہی انعامات کا یہ طریق نہیں بلکہ اس میں جتنا کام کرو گے اس سے بڑھ کر انعامات ملیں گے اور جب چھوڑ دو گے تو یہی نہیں کہ صرف آئندہ کے لئے انعامات بند ہو جائیں گے بلکہ پہلے انعام بھی چھن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام انعامات کی یہی کیفیت ہے۔ علم ہی کو لے لو۔ یہ الٰہی انعام ایسا ہے کہ جب تک اسے حاصل کرتے رہو' اس میں کوشاں رہو یہ بڑھتا رہتا ہے لیکن جب اسے چھوڑ دو یہ نہیں کہ آئندہ کی ترقی رک جائے گی بلکہ پہلا حاصل شدہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ غرض الٰہی انعام اس کیفیت کے حامل ہوتے ہیں کہ انہیں جتنا چاہو بڑھاتے چلے جاؤ وہ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ لیکن جہاں کھڑے ہو جاؤ ان کا آئندہ حصول بند کر دو' پہلے بھی چھن جائیں گے۔ اس لئے مومن کو ہمیشہ اپنے کام رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت کے ماتحت کرنے چاہئیں۔ یعنی کاموں کو شروع کرنے کے بعد استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے۔ اگر کوئی انسان کسی وقت یہ خیال کرتا ہے کہ میں آئندہ اپنی کوشش بند کر دوں اور کوئی کام نہ کروں تو اس کا یہی

مطلب ہو گا کہ وہ چاہتا ہے میں بیمار ہو جاؤں' میرے جذبات پژمُردہ ہو جائیں اور میرے دل میں کام کی خواہش نہ رہے کیونکہ کام سے جی چُرانے کے معنی ہی طبیعت کی خرابی اور بیماری کے ہوتے ہیں اور کام نہ کرنے کا خیال ہی مرض کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ غرض کام سے بے دلی اور تنفّر بیماری اور مرض کی علامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں سچا اور اصل انعام یہی ہوا کہ انسان کے اندر کام کی خواہش باقی رہے اور جب تک کام کی خواہش رہتی ہے دل میں اُمنگیں ولولے اور جذبات بھی اٹھتے رہتے ہیں۔ اور جب کام کی خواہش نہیں رہتی' دل بھی پژمُردہ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ مرنے کے بعد زندگی کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ وہاں کوئی کام نہیں ہو گا لیکن اس زندگی کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس میں کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا' انتہاء درجہ کی بے وقوفی اور سخت درجہ کی حماقت ہے۔ وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ کام ہو گا لیکن نہ ایسا کام جو تکلیف کا موجب ہو اور مصیبت معلوم دے بلکہ اس کام کے کرنے سے بشاشت پیدا ہو گی اور بڑھتے ہوئے جذبات کے ساتھ وہاں کام ہو گا کیونکہ وہاں کوئی بیماری کوئی مرض کوئی پژمُردگی نہیں ہو گی۔ غرض عدم استقلال بیماری کی علامت ہے۔ دنیا میں بھی اس کے بد نتائج نکلتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتلایا دین میں تو اس کی خرابی بہت ہی زیادہ ہے۔ پس میں اپنے دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اُستقلال کی صفت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ یہی سلوک ہے کہ جتنا جتنا اس کا بندہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت اختیار کرتا چلا جائے گا' اتنا ہی خدا اس کے لئے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ بنے گا۔ جتنا کوئی رحیم بنے گا اتنا ہی وہ اس کے لئے رحیم بنے گا جتنا کوئی رحمٰن بنے گا اتنا ہی اس کے لئے اس کی صفت رحمانیت بڑھتی چلی جائے گی۔ اور بندہ جتنی مالکیت کی صفت اپنے اندر پیدا کرے گا اتنا ہی خدا تعالیٰ کی مالکیت کا سلوک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ پس عبادات' معاملات اور سلسلہ کے لئے قربانیوں کے کرنے میں ترقی کرتے جاؤ۔ لیکن اگر ترقی نہیں کرسکتے تو کم سے کم جو کام شروع کر دیا شروع کر چکے ہو' اس میں استقلال کے ساتھ قائم رہو۔ مؤمن کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ تنزل نہ کرے اور اگر بڑھ نہیں سکتا تو ایک جگہ ٹھہرا تو رہے۔ اور اگر وہ ایسا کرے گا اور صبر سے کام لے گا تو یقیناً وہ انعام بھی حاصل کرے گا اور جب انعام حاصل ہونے شروع ہو جائیں گے تو پھر اسے استقلال اور صبر کی تلقین کی بھی ضرورت نہیں رہے گی' بلکہ وہ دوسروں کو نصیحت اور وعظ کرے گا کہ نیکی کے کام کرو' ان پر مداومت اختیار کرو۔ اس طرح کرنے سے تمہیں بھی انعام ملیں گے جس طرح مجھے ملے۔

اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو اپنی صفات کا کامل مظہر بننے کی توفیق عطاء فرمائے اور ان راہوں پر چلائے جس پر چلنا اس کی خوشنودی کا باعث ہو اور ایسے مقام پر ہمیں کھڑا کرے جہاں اس کے انعامات ہمارے لئے بڑھتے ہی جائیں۔

(الفضل ۲۹۔ ستمبر ۱۹۳۲ء)

۱؎ النحل: ۹۳